عالم اسلام میں احیائی فکر کی مشترک بنیادیں

(ولی اللّٰہی، وھابی اور سنوسی تحریکات کا مطالعہ)

جناب محمد اعظم قاسمی صاحب

اٹھارویں صدی کے آغاز میں دو نامور مصلحین اسلامی دنیا کے دو مختلف حصوں میں نمودار ہوئے یعنی شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ محمد ابن عبدالوہاب نجدی اگرچہ ان دونوں کا تعلق وطنی لحاظ سے ایسے خطّوں سے تھا جو ایک دوسرے سے انتہائی مختلف اور ممتاز تھے لیکن اس کے باوجود ان دونوں مصلحین کے مقاصد اور مطمح نظر میں واضح اشتراک اور مماثلت نظر آتی ہے اس مقالے میں ہم ہندوستان، جزیرہ نمائے عرب اور شمالی افریقہ میں ظاہر ہونے والے احیائی رجحانات پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ ہم ان عوامل اور وجوہ تک پہنچنے کی کوشش کریں جن کی بنیاد پر ان کے درمیان مشترک مقاصد اور مشترک آئیڈیل کی موجودگی کا احساس پیدا ہوتا ہے ان مشترک بنیادوں میں سے چند باتیں تو اُن احیائی تحریکوں میں بیک نظر محسوس کی جاسکتی ہیں جن کو عام طور پر وہابی ولی اللّٰہی اور شمالی افریقہ کی سنوسی تحریکات کے نام سے دنیا جانتی ہے۔ تاہم ان تحریکات میں ایسے متعدد خصائص کی موجودگی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا جو ان کے اپنے انفرادی خصائص ہیں اور ان کے لیے ایک دوسرے سے ذریعۂ امتیاز بھی لیکن انفرادی خصائص کے اس پہلو کو مختصر طور پر ہم اس مضمون کے اختتامی مباحث میں دیکھیں گے۔

شائد محتاط طور پر یہ کہنا ممکن ہے کہ ان مختلف تحریکات کے اپنے اپنے علاقوں میں ابھرنے اور پروان چڑھنے کے ذمہ دار وہ مخصوص علاقائی احوال یا وہ صورت حال تھی جو مجموعی طور پر پورے عالم اسلام میں اور مخصوص طور پر ان خطوں میں ایک خاص حد تک پہنچ چکی تھی اسی طرح یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ ان تحریکات نے اپنے اپنے خطوں میں جو شکل اور جہت اختیار کی وہ درحقیقت اپنے دور اور وقت کی ایک شدید ضرورت کی تکمیل کا درجہ رکھتی ہے مثال کے طور پر وہ خاص سیاسی اور سماجی پس منظر جس میں شاہ ولی اللہ نے کھڑے ہوکر اصلاحی تنقیدات

پیش کیں، بلاشبہ وہ ہندوستان کے زوال پذیر مسلم معاشرے کا ایک ایسا آئینہ تھا جس میں ہر قسم کی روحانی اور علمی قوتیں بستر مرگ پر نظر آرہی تھیں اور چاروں طرف لاقانونیت، سیاسی انتشار اور اخلاقی اور معاشرتی ابتذال کا دور دورہ تھا[۵] اختلاف مناطق واحوال کے ساتھ بڑی حد تک یہی بات شمالی افریقہ اور جزیرہ نمائے عرب کے مصلحین کے پس منظر کے سلسلہ میں بھی صادق آتی ہے[۵]

اگرچہ شیخ ابن عبدالوہاب اور محمد ابن علی سنوسی کے ہاں اس طرح کی ہمہ گیر معاشرتی تنقید نظر نہیں آتی[۵] جیسی شاہ ولی اللہ کی تحریروں میں جابہ جا ملتی ہے مگر اس کے باوجود اول الذکر دونوں مصلحین کے عملی اقدامات اسی سماجی انصاف اور سیاسی منزل کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کی اساس اسلامی تاریخ کے ابتدائی نمونے ہیں مثلاً شیخ ابن عبدالوہاب نے اسلام کے خالص تصور توحید پر از اول تا آخر زور دیا ہے یہاں تک کہ معاندین کے دئے ہوئے نام "وہابی" کے مقابلے میں انھوں نے خود کو "موحدین" کہلانا پسند کیا اس کے ساتھ ہی عقیدہ توحید کے عملی پہلو پر بھی انھوں نے یکساں زور دیا اور اس راہ میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کی یعنی حدود اسلام میں وہ کسی بدعت کو خواہ وہ عقائد میں ہو یا عمل میں ہو کسی قیمت پر برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے[۵]۔ دوسرے لفظوں میں ان کی سخت تنقید کا نشانہ ایسے عوامی طریقے تھے جیسے بزرگوں کے مزارات اور قبروں پر غیر اسلامی عقیدت یا مقاصد کے ساتھ جانا ان پر چادریں چڑھانا یا قبور کو پختہ کرانا اور عمارات بنانا[۵]۔ ابن عبدالوہاب نے ایسے لوگوں پر شدید اور کھلی تنقید کی جو مرنے والے بزرگوں کے سلسلہ میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ روز قیامت ان کی طرف سے شفاعت کی صلاحیت رکھتے ہیں شیخ ابن عبدالوہاب نے شاہ ولی اللہ کی طرح ان سماجی عوامل کو سمجھنے یا پیش کرنے کی کوشش نہیں کی جن کے نتیجے میں ایسا ماحول پیدا ہوا جس میں غیر اسلامی اوہام اور اعمال کو معاشرے میں پنپنے کا موقع ملا۔

دوسری طرف محمد ابن علی سنوسی کے ہاں شمالی افریقہ کی مسلم معاشرت میں پھیلی ہوئی سماجی برائیوں کی کوئی نظری تنقید نہیں ملتی تاہم حقیقت یہ ہے کہ پوری سنوسی تحریک ان عملی اقدامات سے عبارت ہے جن کا مقصد معاشرتی خرابیوں اور غیر اسلامی طریقوں سے مسلم سوسائٹی کو پاک کرنا تھا[۵]۔ شیخ سنوسی کی جدوجہد کا ماحصل زیادہ تر ریگستان صحارٰی کے وسیع دامن میں خانقاہوں اور زاویوں کو قائم کرنا تھا تاہم شیخ سنوسی نے ان خانقاہوں کو چلانے کے سلسلہ میں ایک ایسا معاشرتی نظام اختیار کیا جس نے نہ صرف وہاں کے بربر قبائل کی اخلاقی حالت سدھارنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا بلکہ اصلی شعائر اسلام اور خالص اسلامی تعلیمات کی

رغبت بھی ان میں پیدا کر دی۔[۴۵] ان زاویوں کے قیام اور انتظام کے لیے شیخ سنوسی نے عام صوفیانہ طریقوں سے ہٹ کر غیر معمولی طریقے اختیار کئے جو نہایت کامیاب ثابت ہوئے اس لحاظ سے کہ نہ صرف ان زاویوں میں مریدین کو صوفیانہ اوراد و وظائف کی تربیت دی جاتی تھی بلکہ اس کے ساتھ ہی ہر ایک کو سماجی اور اقتصادی نوعیت کی ذمہ داریاں بھی سپرد کی جاتی تھیں یہ خارجی ذمہ داریاں ان کے علاوہ تھیں جو اشاعت اسلام کے سلسلہ میں ان کو دی جاتی تھیں شیخ سنوسی اول کی حیات ہی میں ۲۰ سے زائد ایسی خانقاہیں وجود میں آچکی تھیں جو ایک دوسرے سے قابل لحاظ فاصلے پر تھیں بعد کی دہائیوں میں ان زاویوں کی تعداد ۳۰۰ سے بھی زیادہ تک پہنچ گئی تھی[۴۶] اور وہ شمالی افریقہ کے طول و عرض بلکہ اس کی حدود سے باہر بھی پھیل گئی تھی کئی شاہراہیں جو ان زاویوں کے درمیان تھیں راہزنوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھیں جس کے نتیجے میں تجارتی روابط اور قافلوں کے لیے یہ سڑکیں حد درجہ غیر محفوظ بن گئی تھیں۔ شیخ سنوسی نے اپنے مریدین اور متوسلین کو ان رہزن قبائل کے پاس بھیجا ان لوگوں نے نہ صرف ان قبائل سے اس مسئلہ پر گفت و شنید کی بلکہ اپنا تبلیغی پیغام بھی ان تک پہنچایا اس تلقین کا اثر یہ ہوا کہ نہ صرف وہ راستے محفوظ ہو گئے بلکہ ان راہزن قبائل کے بیشتر لوگوں نے اپنے پیشے سے توبہ کی اور شیخ کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔

اسی طرح غیر اسلامی طریقوں سے مکمل اجتناب پر شیخ سنوسی کی خصوصی تاکید نے بڑی حد تک بربر قبائل میں معاشرتی یکجہتی اور اخلاقی پاکیزگی کی ایک عام روح بیدار کر دی۔

شیخ سنوسی کی قوتِ عمل کا رخ ایک طرف غیر اسلامی طریقوں سے مسلم معاشرت کو محفوظ کرنے اور صفائی باطن کے حصول کی طرف تھا اور دوسری طرف جیسا کہ ان کی مجموعی کوششوں سے ظاہر ہے ان کی خواہش تھی کہ بربر سوسائٹی میں اسلام ایک شعبۂ حیات کے بجائے ایک مکمل طریقۂ حیات کے طور پر اختیار کیا جائے اگرچہ طرز فکر اور طرز عمل کی سطحوں میں خاصا انفرادی فرق نظر آتا ہے تاہم ہندوستان اور عربی مصلحین کے ہاں بھی یہی نقطۂ نظر مشترک طور پر ملتا ہے اور یہ دونوں مصلحین بھی اس حقیقت کے اظہار میں تکرار اور تاکید سے کام لیتے ہیں کہ مسلمانوں کی زندگی مجموعی حیثیت میں قرآن و سنت پر مبنی اور اسلامی فکر و عمل سے مملو ہونی ضروری ہے۔

شاہ ولی اللہ کے ہاں باقی دونوں مصلحین کے برخلاف اس پہلو پر طویل مرتب مباحث

ملتے ہیں کہ اسلام کس طرح انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے رہنمائی کا سامان مہیا کرتا ہے[۱۱]
دوسری طرف شیخ ابن عبدالوہاب کی نگاہ بیشتر عقائد اور اعمال کی تطہیر تک محدود نظر آتی ہے اسلامی اصولوں اور احکام کے مباحث میں شاہ ولی اللہ کی ایک منفردانہ اور کامیاب کوشش شریعت اسلامی کی مخفی حکمتوں اور عقلی بنیادوں کو کھول کر بیان کرنا ہے۔ اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں احکام شریعت کی حکمتوں کو جس طرح بے نقاب کیا ہے اس سے ان کی آفاقی نظر اور علمی تعمق کا گہرا اور بھرپور احساس ہوتا ہے اور اس حقیقت کو ماننا پڑتا ہے کہ عرب اور افریقی مصلحین کے بالمقابل شاہ ولی اللہ کا اسلامی نقطۂ نظر کہیں زیادہ وسیع ہے شاہ ولی اللہ کے ہاں ایک اہم ترین حقیقت یہ نظر آتی ہے کہ انھوں نے اسلامی عقائد، ارکان اور افکار کے کسی خاص پہلو پر کہیں بھی اس طرح زور نہیں دیا ہے کہ اس کے نتیجے میں کوئی دوسرا پہلو نظر سے اوجھل ہو جائے یا غیر اہم بن جائے مثلاً جب وہ قرآن وحدیث کی ضرورت واہمیت پر زور دیتے ہیں اس وقت بھی وہ اسلامی معاشرت اور معیشت اور غیر اسلامی نظام سے وجود پانے والی خرابیوں اور برائیوں کی طرف سے آنکھ بند نہیں کرتے۔[۱۲]

مگر دوسری طرف افریقی مصلح شیخ سنوسی کا ذہن جہاد اور صفاء باطن کے اسلامی نقطۂ نظر میں ڈوبا ہوا ہے اور ان کی تمام تر توجہ زاویوں کے قیام اور استحکام کی طرف مبذول ملتی ہے جزیرہ نمائے عرب کے احیاء پسند شیخ کے ہاں تو بظاہر کسی معاشرتی دباؤ یا مسائل کی موجودگی کا کوئی واضح احساس ملتا ہی نہیں ان کی توجہات کا محور غیر اسلامی اعمال یا عقائد میں داخل ہو جانے والے غلط نظریات کی تطہیر تھی۔ ان کے نزدیک مسلم معاشرت کے سیاسی، معاشی اور دینی زوال کی واحد وجہ اسلامی عقائد میں داخل ہو جانے والا غلط نقطۂ نظر تھا اگر اسلامی عقیدے کی طرف مسلمانوں کی نظر اساسًا درست ہو جائے تو تمام اسلامی معاشرہ خود بخود صحیح ہو جائے گا۔[۱۳]

تاہم یہ ایک الگ بات ہے کہ شاہ ولی اللہ کی نگاہ وسیع ترین تھی اور شیخ ابن عبدالوہاب کی نظر تینوں مصلحین میں اسلامی اصلاحات کی حد تک محدود تر تھی اس سے یہ فرض کرنا کہ تینوں مصلحین اسلامی طریقۂ حیات کے سلسلہ میں اپنے اصلاحی نقطۂ نظر میں باہم مخالف جہات رکھتے تھے درست نہیں ہوگا بنیادی طور پر اس حد تک تینوں مصلحین اپنی اصلاحی کوشش میں متفق نظر آتے ہیں کہ تمام اسلامی اصلاحات کی اساس صرف رسول اکرمؐ کا اسوہ اور صحابۂ کرامؓ کے نمونے ہی بن سکتے ہیں[۱۴] اور اس لحاظ سے یہ سمجھنا اور کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان مصلحین کی وسعت نگاہ اور تنگیٔ نظر بڑی

حد تک ان علاقائی احوال کی پیداوار تھی جو مثلاً شمالی افریقہ اور عرب میں بیرونی دنیا سے نسبتاً الگ تھلگ اور غیر متاثر معاشرے کی صورت میں اور دوسری طرف ہندوستان کی نسبتاً تمدنی برتری اور متواتر سیاسی انتشار کی صورت میں ملتی ہے۔

اتفاق نظر کی ایک نمایاں مثال تینوں مصلحین کے ہاں مسئلہ اجتہاد ہے جس کی ضرورت وہاں پیش آسکتی ہے جہاں قرآن، حدیث اور اجماع سے براہ راست کسی مسئلہ کی شرعی نوعیت طے نہیں ہو سکتی اس باب میں تینوں کا اتفاق نظر اس حقیقت کی موجودگی میں اور بھی اہم ہے کہ بڑے بڑے علما بھی اجتہاد کا دروازہ دوبارہ کھولنے کے حق میں نظر نہیں آتے اور نہ اس بارے میں کسی کا اظہار خیال پسندیدہ سمجھا جاتا ہے تعجب کی بات یہ ہے کہ اس مسئلہ پر سب سے زیادہ پرزور آواز عربی ریفارمر کی نظر آتی ہے جو کھل کر کہتے ہیں کہ مسلم معاشرے کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اجتہاد کا دروازہ دوبارہ نہ کھولا جائے۔[۱۶] اگرچہ ابن عبدالوہاب مسلکاً حنبلی ہیں مگر اس کے باوجود وہ پوری بے تکلفی سے یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ مسائل میں حنبلی فیصلوں کا اتباع اسی وقت تک کرتے ہیں جب تک کہ ان کی دانست میں یہ فقہی فیصلے احادیث رسولؐ اور قرآنی روح سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوں اور جس گھڑی بھی کوئی حنبلی فقہی فیصلہ ان کی دانست میں اور ان کے علم کی حد تک قرآن و حدیث سے کسی درجہ میں بھی معارض ہوگا تو وہ اس کو اسی آن ترک کر دیں گے اور اپنے اطمینان قلبی کے مطابق عمل کریں گے دوسرے الفاظ میں وہ فقہ کے کسی خاص مسلک کو آنکھیں بند کر کے اختیار کرنے کے قائل نہیں ہیں اور جہاں بھی حنبلی مسلک میں انھیں اطمینان قلبی میسر نہ آئے تو وہاں وہ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھنا چاہتے ہیں اس معاملے میں بھی وہ دیگر معاملات کی طرح علامہ ابن تیمیہ سے خاص طور پر متاثر نظر آتے ہیں جنھوں نے تقریباً پانچ سو سال پہلے ہر قسم کے مظالم اور مخالفت کے باوجود پوری بے تکلفی سے یہی بات کہی تھی۔

شیخ سنوسی بھی اس بات میں پورے طور پر ابن عبدالوہاب کے ہم نوا ہیں۔ شیخ سنوسی جنھوں نے شمالی افریقہ کے شہر فاس میں زبردست علمی صلاحیت حاصل کی تھی اور اپنے شیخ طریقت محمد ابن ادریس کی مصاحبت میں جن کا وقت گزرا تھا — وہ بھی اسی نتیجے پر پہونچے تھے کہ مسلم سوسائٹی کے ارتقاء کے لیے اجتہاد کا اصول نہایت ضروری ہے ہر لمحہ تغیرات سے دوچار رہنے والے انسانی معاشرہ کے لیے ایک لچک دار اصول قانون سازی کی موجودگی بھی ایک

لازمی ضرورت ہے اور خاص طور پہ مذہبی دائرے میں اگر یہ مذہب قیامت تک کے لیے انسانی زندگی اور اس کے مسائل کو سلجھانے کی صلاحیت کا دعویٰ بھی رکھتا ہو۔ شیخ سنوسی کے نزدیک شریعت کے دائرے میں انسانی زندگی اور معاشرت کے فروعی تقاضوں کی تکمیل کا یہ ذریعہ اصول اجتہاد کی صورت میں موجود ہے۔

اس مسئلہ پر پہلے دو مصلحین کے مقابلہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کا موقف نسبتاً غیر واضح اور مصلحتوں میں دبا ہوا نظر آتا ہے اگرچہ شاہ صاحب بھی اس کے مخالف نہیں ہیں کہ جہاں انتہائی ضروری ہو وہاں اجتہاد کا اصول برتا جاسکتا ہے تاہم اس مسئلہ پر اظہار خیال کرنے میں وہ نسبتاً بہت محتاط نظر آتے ہیں اور اس کی کھلی چھوٹ تو ہرگز نہیں دینا چاہتے ان تحریروں سے یہ بھی واضح ہے کہ وہ حنفی مسلک کے لیے ترجیح رکھتے ہیں مگر دوسری طرف یہ تاثر بھی بار بار ابھرتا ہے کہ اگر کسی فقہی مسئلہ کی تنگی کی موجودگی میں فقہاء اربعہ میں سے کشادہ تر اور زیادہ وسیع المعنیٰ فقہی فیصلہ میسر آسکتا ہے تو وہ اپنے کو کسی خاص فقہی مسلک کا لازماً پابند نہیں بنانا چاہتے۔ اسی طرح ذاتی حد تک وہ بدلتی ہوئی انسانی معاشرہ کے لحاظ سے اجتہاد کی بنیادی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ اس اصول کو علماء کے ایک ایسے طبقے تک محدود رکھنے کے حق میں ہیں جو نہ صرف علمی صلاحیت اور جامعیت سے لیس ہو بلکہ اپنے فرض منصبی کا بھی پوری دیانت داری سے احساس رکھتا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کی یہ ایک عام خصوصیت ہے کہ وہ کسی بھی اختلافی مسئلہ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے وقت حد درجہ محتاط ہو جاتے ہیں۔ ان کے اصلاحی مقاصد میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ مسلم معاشرے کے مختلف الخیال طبقوں میں اتحاد نظر پیدا کرسکیں۔ اور اسی طرح مخالف آراء میں بلکہ متضاد افکار میں بھی اگر ممکن ہو تو ایک درجہ تک ہم آہنگی اور یکسانیت پیدا کرسکیں یہ بات پورے طور پر اس وقت واضح ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے شیعہ سنی اختلافات کو مٹانے کے لئے ایسے پہلوؤں پر زور دیا ہے جن میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے اس بات کی مزید توثیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ انھوں نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے بظاہر متقابل یا متضاد نظریات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے شاید مسلم معاشرے کے انہی مختلف الخیال طبقوں اور متعارض آراء میں یکجہتی باقی رکھنے کی وجہ سے شاہ صاحب نے اجتہاد کی ضرورت کے سلسلہ میں اپنی آزادانہ رائے

کو اتنی احتیاط اور شرائط کے ساتھ ظاہر کیا ہے اس لیے کہ اس بارے میں بے تکلفانہ اظہار خیال لازمی طور پر ایک وسیع اختلاف کو جنم دے سکتا تھا بالفاظ دیگر شاید محتاط طور پر یہ کہنا ممکن ہے کہ شاہ صاحب اجتہاد کے مسئلہ کو کھل کر طے کر دینے کی خواہش رکھتے تھے لیکن مسلم معاشرے میں یکجہتی برقرار رکھنے اور غیر ضروری اختلافات کا دروازہ کھولنے سے احتراز کی بنا پر انھوں نے اتنا محتاط رویہ اختیار کیا۔ شاہ صاحب کے علمی تبحر اور ہر مسئلہ کے متضمنات اور متعلقات کو بیک وقت نظر میں رکھنے کی صلاحیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہنا بھی قرین قیاس ہے کہ انھوں نے مسئلہ اجتہاد پر معاشرتی مصلحت سے زیادہ علمی دیانت داری کے مقتضا کو پورا کیا ہے۔ تاہم اس کے باوجود اجتہاد کے بارے میں ان کی رائے ان کے مخصوص اتحادی مزاج کی آئینہ دار ہے۔

اصلاحی فکر کا ایک اہم پہلو جو ان تینوں مصلحین کے درمیان مشترک بھی ہے اور موکد بھی وہ مذہب کی روحانی سے زیادہ مادی تعبیر ہے دوسرے لفظوں میں اخروی سے زیادہ دنیاوی اہمیت ہے یعنی اخلاقی اصلاح کی طرف خصوصی توجہ کے باوجود یہ تینوں بزرگ ایک مسلم فرد کو رہبانیت یا ترک دنیا کا درس نہیں دیتے نہ ان کی تعلیمات میں اخروی زندگی کی جزا و سزا کے پہلو پر زیادہ زور نظر آتا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کے اصلاحی خیالات میں مجموعی طور پر دنیاوی زندگی کے اخلاقی، معاشرتی اور معاشی نفع و نقصان، خوبیوں اور خرابیوں کی طرف زیادہ تر توجہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی زوال انگیز معاشرت کا بہت قریب سے مطالعہ کیا تھا اور اپنی اصلاحات میں انہی چیزوں کو زیادہ اہمیت دی جو اس معاشرتی بگاڑ کی ذمہ دار نظر آئیں مزید برآں یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اپنی اصلاحات کی بنیاد اصلاً تینوں مصلحین نے اسلام کے عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ کے IDEAL پر رکھی تھی۔ یہ رجحان اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ مسلم تاریخ میں صدیوں کے بعد یہ نقطۂ نظر میں ایک بنیادی تبدیلی تھی اور مسلم معاشرے کو مکمل جمود سے بچانے کی ایک قوی جدوجہد تھی حقیقت یہ ہے کہ اخروی زندگی کی جزا اور سزا کی یاد دہانی سے زیادہ اہم اور مسلم معاشرے کی فوری ضرورت اس دور میں یہ تھی کہ اس معاشرے کو اخلاقی مایوسی اور تمدنی بربادی کی دلدل سے نکال کر ہمت اور حوصلے اور اعتدال کی راہ پر لگایا جائے بلاشبہ اس ضرورت کو ان احیائی تحریکوں نے بڑی حد تک پورا کیا۔ ابن عبدالوہاب نے عقائد کی اصلاح کے ذیل میں

اپنی سرفروشانہ جدوجہد کے ذریعہ سے، شیخ سنوسی نے اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی کوششوں کے ذریعہ سے اور شاہ ولی اللہ نے جامع علمی تنقید اور نظریات اسلامی کی تعمیر نو کی راہ سے مسلم سوسائٹی کی اس علمی اور فوری ضرورت کی تکمیل کی ہے۔

ان مشترک اصلاحی کوششوں کی فہرست میں سیاسی جدوجہد یا اس جدوجہد کی نظر باتی راہ ہموار کرنے کا کام بھی تینوں مصلحین کے ہاں نسبتاً خاصا اہم نظر آتا ہے۔ اگرچہ شاہ ولی اللہ براہ راست کسی سیاسی جدوجہد میں شریک نظر نہیں آتے تاہم اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ انھوں نے مسلم معاشرے کی اصلاح اور بقایا سیاسی ابتری سے بچاؤ کے لیے اپنے دور کے بعض اہم سپہ سالاروں سے مراسلت کی تھی جن میں احمد شاہ ابدالی کا نام نمایاں ہے مزید برآں یہ کہ جو کچھ شاہ صاحب اس میدان میں اپنی زندگی میں حاصل نہ کر سکے وہ بڑی حد تک ان کے اخلاف اور شاگردوں نے وقتی ہی طور پر سہی کمل کر کے دکھا دیا۔ سید احمد شہید بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی کے زیر سرکردگی برطانوی استبداد کے خلاف اٹھنے والی جہاد کی تحریک اگرچہ اپنوں کی بے وفائی اور دغابازی کی وجہ سے آخرکار ناکام ہوگئی مگر اس کے باوجود تھوڑی دیر کے لیے افغانستان کے قریب صوبہ سرحد میں ایک آزاد اسلامی حکومت اس کے نتیجہ میں وجود میں ضرور آئی جو خلافت راشدہ کے اصولوں پر استوار کی گئی تھی۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ابن عبدالوہاب کو ابتدا کار ہی میں نجد کے مقتدر سعودی حکمراں کی سیاسی تائید حاصل ہوگئی تھی۔ درعیہ کے اس حکمراں خاندان کی مدد سے وہابی تحریک نہ صرف جزیرہ نمائے عرب میں بہت جلد بااثر بن گئی بلکہ اس کے اثرات شام، عراق اردن تک بھی پہنچنے لگے تھے اس بڑھتے ہوئے خطرے کو دیکھ کر عثمانی سلاطین نے انیسویں صدی کے آغاز میں اپنے مصر کے گورنر محمد علی پاشا کی مدد سے عین سیاسی کامیابیوں کے بیچ میں اس تحریک کو بری طرح کچل ڈالا اگرچہ اگلی ایک صدی تک وہابی تحریک نظروں سے اوجھل رہی لیکن سو سال کے بعد بھی ابن عبدالوہاب اور محمد ابن سعود کے اخلاف کی یکجہتی اور اتحاد اتنا ہی قوی تھا جتنا آغاز میں جس کا ثبوت اس سے بڑا کیا ہو سکتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں کے اخلاف نے مل کر اسی قدیم جوش کے ساتھ نجد کے ریگستان سے نکل کر حجاز کے کوہستان سے برطانوی حکومت کے مسلم نمائندے شریف حسین کو ہٹا کر ایک پائیدار سعودی حکومت قائم کر لی جس کا مسلک آج بھی اسی وہابیت پر مبنی ہے۔

اگرچہ سنوسی تحریک کا آغاز اخلاقی تطہیر اور صفائے باطن کے مقصد سے ہوا تھا لیکن جلد ہی الجیریا (الجزائر) میں فرانسیسی استعماریت سے ان کا ٹکراؤ شروع ہوگیا۔ یہ بات بربر قوم کے مزاج کے عین مطابق ہے کہ وہ صوفیوں کے روپ میں بھی حقیقتاً تصوف و اخلاق سے زیادہ سیاست اور جہاد میں مصروف نظر آئے ہیں ان کی تاریخ میں ایک سے زاید بار ایسا ہوا ہے کہ قرون وسطیٰ میں انھوں نے تصوف اور اخلاق اور تزکیۂ نفس کی مشعل روشن کی اور اس مقصد کے لیے اپنے کو خانقاہوں اور زاویوں میں محدود کرلیا لیکن وہ جلد ہی باہر نکل آئے اور انھوں نے سیاسی اور فوجی تصادم کا راستہ اختیار کیا اور اس کے نتیجہ میں چھوٹی بڑی حکومتیں بھی قائم کرلیں۔ سنوسی قائدین نے بھی جلد ہی سیاسی جدوجہد اور جہاد کا راستہ اختیار کرلیا یہاں تک کہ بیسویں صدی کے اوائل میں بھی لیبیا میں اطالوی استعماری حملوں کا راستہ روکنے میں پوری سرفروشی کے ساتھ مصروف نظر آتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ مغربی استعمار کی قوت کے سامنے آخرکار انھیں پسپا ہونا پڑا۔

ان تینوں مصلحین اور ان کے جانشینوں کی سیاسی جدوجہد کا یہ کردار اس خیال کی مزید تائید اور تصدیق کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ ان تحریکوں کا اصلاحی نقطۂ نظر حیات بعد الموت یا روحانی اور خانقاہی عبادات کے مقابلے میں اسلامی معاشرے کی اخلاقی پستی کو دور کرنے ذہنی اور معاشرتی گراوٹ کا علاج کرنے اور اسلامی عقیدے اور اسلامی نظریۂ زندگی کو واضح کرنے اور افکار کی اصلاح کو اپنا زیادہ بڑا مقصد سمجھتا تھا۔ بہرحال جہاد کا اسلامی نظریہ تینوں مصلحین کے ہاں مشترک عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ صدیوں کے بعد یہ نظریہ دوبارہ اصلاحی جدوجہد اور معاشرتی تطہیر کے فکر کا ایک جز لازم بن کر ابھرا۔ صوفیانہ عزلت نشینی اور گوشہ گیری تمام اسلامی دنیا میں بیشتر ہر قسم کی سیاسی جدوجہد سے بعید اور یکسو نظر آتی ہے چہ جائیکہ اس کے اساسی عناصر میں نظریۂ جہاد شامل ہو اس کے بالکل برعکس اسلامی تاریخ میں سیاسی جدوجہد بالعموم تصوف اور روحانیت سے عاری اور علیحدہ نظر آتی ہے۔

ان متضاد رجحانات کی توضیح درحقیقت مسلم معاشرے میں وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی زوال انگیز صورت حال سے ہی ممکن ہے۔ پوری اسلامی دنیا کا سماجی، سیاسی اور اقتصادی نظام بالکل بگڑ چکا تھا اور ہر طرف افراتفری کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ اسلامی دنیا کی اس عام ابتری نے مغربی ترقی پذیر اقوام کو یہ موقع فراہم کردیا تھا کہ وہ ایک ایک کرکے مسلم ملکوں پر قبضہ کرکے انھیں اپنے مستعمرات میں شامل کرلیں۔

یقیناً اس تمام صورت حال کا چشم بصیرت سے مطالعہ کرنے والے مسلم مصلحین اور احیا پسندوں کو ابتداء میں ایک طرح کی مایوسی کا بھی سامنا ہوا ہوگا دوسرے الفاظ میں ان مصلحین نے محسوس کیا ہوگا کہ مسلم دنیا کا یہ بگاڑ صرف اخلاق اور مذہبی عقائد کا بگاڑ نہیں ہے بلکہ اس کی یہ کم زوری اتنی نمایاں ہو چکی تھی کہ کوئی اصلاحی کوشش بھی معاشرتی اور اقتصادی زندگی کے مسائل کو نظر انداز کر کے صرف مذہب اور اخلاق کی اصلاح پر اکتفا نہیں کر سکتی تھی۔ اسلامی دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلے ہوئے ایک عام جمود اور ابتری کا مشاہدہ ہی وہ سبب خاص تھا جس نے ان تحریکات کے بانیوں کو اپنی اصلاحی جدوجہد میں بیک وقت تطہیر نفوس اور تعمیر سیاست کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

ان تینوں احیائی تحریکات کے بانیوں کے درمیان افکار کے اشتراک کے باوجود جیسا کہ جزوی طور پر ہم اوپر دیکھ چکے ہیں باہمی طور پر انفرادی مزاج اور مقامی حالات کے لحاظ سے ایک واضح فرق بلکہ کہیں کہیں اختلاف بھی محسوس ہوتا ہے اس کا تعلق ان حضرات کی بنیادی تعلیم و تربیت نیز ماحول و معاشرت کا فرق ہے۔ اس فرق سے قدرتی طور پر ان میں سے ہر ایک کے دل و دماغ کا ایک مخصوص سانچہ وجود میں آیا تھا جس کی وجہ سے ان کی جدوجہد کی راہیں بھی مختلف ہو گئیں اجمالاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ بنیادی طور پر ایک غیر معمولی صاحب بصیرت اور علمی معنی میں اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے حامل انسان تھے ان کی جدوجہد کا بہترین ماحصل یہ تھا کہ متخالف نظریات اور گروہوں میں روابط کی یک جہتی اور نظریاتی اتحاد پیدا کیا جا سکے اس کے برخلاف شیخ ابن عبدالوہاب اور ان سے بھی زیادہ ان کے اخلاف ایسے مثالیت پسند تھے جو کسی مفاہمت سے سروکار رکھنے کے بجائے ہر قیمت پر اپنے آئیڈیل کی تکمیل چاہتے تھے خواہ اس کی وجہ سے کتنا ہی اور کسی کا بھی نقصان کیوں نہ ہو اور اسی وجہ سے ان کے مخالفین اور دشمنوں کو ان کی اس اصلاحی جدوجہد کو بدنام کرنے کے لیے بڑی آسانی اور کامیابی سے مواد حاصل ہو گیا اسی طرح شمالی افریقہ کے شیخ سنوسی کی صوفیانہ اور بعد ازاں سیاسی کوششوں نے بڑی حد تک انھیں اس علم و دانش کی فیض رسانی سے محروم رکھا جس کے وہ اہل تھے۔

تینوں تحریکات کے ان اہم تر پہلوؤں کے تحلیل و تجزیہ کے بعد اب ہم نسبتاً اختصار کے ساتھ اس مشترک آئیڈیل کا ذکر کریں گے جو ان تحریکات کے سامنے تھا۔ وہ ہے اسلام کی طرف مراجعت۔

ان تینوں تحریکات میں مقاصد کی یکسانیت کی سب سے پہلی اور اہم اساس تطہیر عقائد

اور ایمان ہے تینوں ہی مصلحین کو اسلامی عقائد میں باہر سے داخل ہونے والے عناصر پر گہری تنقید کرتے ہیں۔ لیکن اسلام کو بدعات اور اوہام سے پاک کرنے کی اس مجاہدانہ کوشش میں شیخ ابن عبدالوہاب سب سے بیش پیش نظر آتے ہیں۔

اس احیائی رجحان کی دوسری اساس جو تینوں مصلحین کے ہاں یکساں تاکید کے ساتھ موجود ہے وہ قرآن اور حدیث کی طرف رجوع کی ضرورت ہے جو نہ صرف اسلامی عقائد بلکہ تمام قوانین اسلام اور فقہ کی اساس ہیں اس میدان میں سب سے آگے شاہ ولی اللہ نظر آتے ہیں جنھوں نے ایک طرف ترجمۂ قرآن کی راہ کھولی اور دوسری طرف کتب حدیث کے وسیع تر درس و تدریس کی بنا ڈالی۔

قرآن و حدیث کے براہِ راست مطالعہ پر اس تاکید کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیمی نصابات کا غیر دینی حصہ جس میں تاریخ، ادب، ہیئت، فلسفہ اور شعر وغیرہ داخل تھے اور جس کو اکثر معقولات کے حوالے سے یاد کیا جاتا تھا، ان کی طرف خود بخود توجہ کم ہوگئی اسی طرح قدیم نظام تعلیم میں جو توجہ فقہی مباحث کو حاصل تھی اس میں بھی نمایاں کمی ہوتی چلی گئی اسی کا ایک فطری نتیجہ کہا جائے ان مصلحین نے شریعت اسلامی کے چوتھے مآخذ پر زیادہ زور دیا جس کو مختلف قانونی احوال کے مطابق قیاس یا رائے یا اجتہاد کا نام دیا جاتا ہے اپنے اپنے مزاج کے لحاظ سے اس میدان میں شیخ ابن عبدالوہاب بڑی قوت کے ساتھ اس کے حق میں نظر آتے ہیں جب کہ امام الہند شاہ ولی اللہ اس بات میں جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے نہایت محتاط ہیں۔

احیائی رجحان کی مشترک بنیادوں میں ایک بہت اہم پہلو جہاد اسلامی کا ہے میدانِ جہاد کی یہ قوتِ عمل ہمیں تین میدانوں میں فعال نظر آتی ہے۔ اولاً اس غیر اسلامی طریقۂ حکومت کے خلاف جس کے نتیجہ میں سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی خرابیوں کو ابھرنے اور پنپنے کا موقع ملا جیسا کہ ہم شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں کی عملی جدوجہد اور اصلاحی کوشش کے ذکر میں دیکھ چکے ہیں ثانیاً اس توہم پرست مسلم معاشرہ کے خلاف جو غیر اسلامی عقائد، اوہام اور رسوم میں غرق تھا جیسا کہ ابن عبدالوہاب کی سیاسی جدوجہد کے میدان میں ہم نے دیکھا ثالثاً سلطنت پرست مغربی یورپ کے استعماری غلبے کے خلاف جیسا کہ افریقی مصلح شیخ سنوسی کے احوال کے ذیل میں ذکر آچکا ہے۔

عالم اسلامی کے مختلف خطوں میں بکھری ہوئی یہ صورتِ حال اس بات کی مقتضی تھی

کر سیاسی فعالیت اور جہاد کی روح کو نئے سرے سے زندہ کیا جائے جو احیائی انداز سے اسلام کی اصلیت اور حقیقت کو پھر سے دنیا کے سامنے پیش کر سکے یہی خدمت ان تحریکوں نے انجام دی۔

حوالے اور تعلیقات

۱۔ محمد میاں : علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد اول وثانی یکجا (لاہور ۱۹۷۷)، صد ۴۲-۱

۲۔ احمد امین : زعماء الاصلاح (عربی)، (قاہرہ ۱۹۴۸)، صد ۱۸-۱۷

۳۔ ایضاً : صد ۱۵

۴۔ محمد بن عبدالوہاب : کتاب التوحید مشمولات الجامع الفرید (ریاض)، صد ۱۶-۱۵

۵۔ ایضاً صد ۱۰۱-۱۰۲

۶۔ ایضاً ط ۹۱-۸۸، صد ۲۱۳

۷۔ شیخ سنوسی کی عبقریت کا اعتراف دشمنوں اور دوستوں نے اسی طرح کیا ہے جس طرح ان کی بلند کرداری اور حسن خلق کا (نکولا زادہ، سنوسیہ صد ۵، (لیڈن ۱۹۶۸) تاہم ان کی اصل مصروفیت روحانی اصلاح اور تزکیۂ باطن تھا جس کے سلسلے میں انھوں نے صحرائے افریقہ میں زاویوں اور خانقاہوں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ پرپیچ سیاسی صورتِ حال اور وہ معاشرتی ماحول جس میں شاہ ولی اللہ نے آنکھ کھولی تھی اور جس پر بعد میں شدید تنقید کی اور اس کی جگہ اصولِ اسلام کو ایک جامع تعبیر کے ساتھ پیش کیا تھا وہ افریقہ اور عرب کے ریگستانوں میں اس پیچیدگی کے ساتھ موجود بھی نہیں تھی۔

۸۔ نکولا زادہ : صد ۴۶

۹۔ پہلا زاویہ یا خانقاہ ۱۹۳۲ میں جغبوب کے مقام پر قائم کیا گیا اس زبردست رجوع کی وجہ سے جو اس خانقاہ کو حاصل ہوا بہت جلد نئے زاویوں کے قیام کی ضرورت پیدا ہوئی یہاں تک کہ نہ صرف ان سنوسی خانقاہوں سے جبل اخضر کا علاقہ آباد ہو گیا بلکہ اگلی چند دہائیوں میں ان کا دائرہ تیونس، الجیریا، لیبیا، مصر اور سوڈان تک وسیع ہو گیا۔ ان خانقاہوں کی مجموعی تعداد ۱۲۰ سے ۲۰۰ تک بیان کی جاتی ہے جن میں کم سے کم ۲۰ شیخ محمد ابن علی سنوسی کے ہاتھوں قائم ہوئی تھیں۔

۱۰۔ ان راہزنوں میں سب سے زیادہ بدنام زمانہ زویہ قبیلے کے افراد تھے جن کی وجہ سے شیخ سنوسی کی روحانی کوششوں میں ابتداءً بہت رکاوٹ پیدا ہوئی خاص طور سے جبکہ وہ جغبوب سے کفرہ کی خانقاہ میں منتقل ہو گئے

۱۰ نکولازادہ ص۲۹ - فوادشکری السنوسیہ: دین ودولۃ (عربی) ص۳۶-۳۲

۱۱ م۔م شریف: (ایڈیٹر) A HISTORY OF MUSLIM PHILOSOPHY

مقالہ: شاہ ولی اللہ، عبدالحمید صدیقی ص۵۹-۱۵۵۸ (ویسبیڈن ۱۹۶۶)

۱۲ ایضاً ص۶۰-۱۵۵۹

۱۳ ایضاً ص۶۷-۱۵۵۹

۱۴ احمدامین: ص۱۵

۱۵ موازنہ کے لیے دیکھئے حجۃ اللہ البالغہ، کتاب التوحید اور ایقاظ الوسنان۔

۱۶ ابن عبدالوہاب ص۱۶۱

۱۷ احمدامین: ص۱۳

۱۸ ایضاً

۱۹ ایضاً

۲۰ نکولازادہ ص۸۳، ۸۱؛ فوادشکری ص۳۶، ۳۵

۲۱ شاہ ولی اللہ، الانصاف فی بیان سبب الاختلاف (عربی) میں اردو ترجمہ کے ساتھ، (مطبوعہ عمدۃ المطابع) ص۷۶-۵۷

۲۲ ایضاً

۲۳ ایضاً ص۷۶-۵۷ مسئلہ اجتہاد میں ان کی دلچسپی اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اجتہاد کے عمل کو تین قسم کے مجتہدین میں محسوس کیا (۱) مجتہد مطلق، اس سے مراد وہ مجتہدین ہیں کہ جنھوں نے مسالک فقہیہ کے وجود میں آنے سے پہلے علی الاطلاق اجتہاد سے کام لیا تھا۔ (۲) مجتہد مستقل یعنی وہ ائمہ جنھوں نے کسی خاص مستقل مسلک فقہیہ کی بنا ڈالی۔ (۳) مجتہد بالفتویٰ یعنی وہ مجتہدین جو کسی فقہی مسلک میں محصور رہ کر فتویٰ سے کام لیں، اجتہاد شاہ صاحب کے نزدیک تین شرائط پر موقوف ہے (۱) اجتہاد کے اصولوں کی تشکیل کی صلاحیت (۲) اسلامی علوم یعنی قرآن، حدیث اور فقہ پر مکمل نظر اور دسترس (۳) احوال زمانہ کی مکمل شعور کے ساتھ قرآن وسنت سے استنباط کی پوری صلاحیت۔ م۔م شریف ص۷۶-۱۵۷۵

۲۴ بین الملی اختلافی مسائل پر شاہ صاحب کا مخصوص نقطۂ نظر التطبیق والجمع بین المختلفات تھا یعنی اختلافی معاملات میں تطبیق اور ہم آہنگی دیکھئے SHAH WALI ULLAH; THOUGHT & CONTRIBUTION

K.A. NIZAMI, ISLAMIC CULTURE P.P. 143 Vol. LIV No. 2, APRIL 1980

۲۵ م۔م شریف ص۷۲-۱۵۶۹

۲۶ ان تینوں حضرات مصلحین کے طرز فکر سے ان کے اپنے اپنے معاشرتی ماحول میں یہ بات پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے مزید دیکھئے فضل الرحمٰن، اسلام (انگریزی) صد۱-۲۰۹

۲۷ شیخ محمد اکرام، رود کوثر (لاہور ۱۹۷۵) صد۴۸۵-۵۴۷ محمد میاں: صد۸۱-۷۷

۲۸ محمد میاں: صد۹۵-۱۹۰

۲۹ احمد امین: صد۱۹-۱۸

۳۰ ایضاً صد۱۹

۳۱ GEORGE' ANTONIO, ARAB AWAKEHING, P.P.

۳۲ الجزائر پر ۱۸۳۰ میں فرانس نے قبضہ کر لیا تھا، تیونس پر فرانس کا قبضہ ۱۸۸۱ میں ہوا، دیکھئے نکولا زادہ صد۴۶

۳۳ مذہبی اصلاح کی جس جدوجہد کا آغاز مرابطین کے ہاتھوں گیارہویں صدی میں اور موحدین کے ہاتھوں بارہویں صدی میں ہوا تھا ان کی بنیاد ابتداءً تصوف اور تزکیۂ باطن تھی لیکن بانیانِ تحریک کی وفات کے بعد ان کے سربر جانشینوں نے ان دونوں عوامی طریقت کے سلسلوں کو سیاسی تحریکات میں تبدیل کر دیا اور حکمرانوں سے پنجہ آزمائی اور تصادم کی راہ اختیار کی اس کے نتیجے میں پہلے مرابطین کی بادشاہت وجود میں آئی جس کا دائرہ الجزائر سے ہسپانیہ تک وسیع ہو گیا تھا بعد ازاں موحد سلطنت ظہور میں آئی جس کے دامن حکومت میں ہسپانیہ کے علاوہ پورا شمالی افریقہ آ کر رہا لیکن یہ دونوں حکومتیں نہایت کم عمر ثابت ہوئیں اور اپنے قیام کے سو سال کے اندر اندر معدوم ہو گئیں ان کے مختصر حالات کے لیے دیکھئے P.K. HITTI: ENCYCLOPEADIA OF ISLAM صد۴۹-۵۳۱ تفصیلات کے لیے دیکھئے ابن خلدون جلد چہارم (بیروت ۱۹۵۹) صد۸۹-۳۷۳ صد۵۱۶-۴۷۲

۳۴ فضل الرحمٰن صد۲۰۹

۳۵ ایضاً صد۹۶، ۱۹۵

۳۶ ایضاً صد۲۰۹

۳۷ ایضاً

۳۸ نکولا زادہ صد۵۰

۳۹ ملاحظہ کیجئے شیخ ابن عبدالوہاب کی مختصر اور مدلل و مستند کتاب "کتاب التوحید" جس میں نجدی مصلح نے بڑی دقت پسندی سے وہ تمام قرآنی آیتیں اور احادیث رسول اللہؐ جمع کی ہیں جس میں عوام کے غیر اسلامی عقائد اور رسوم مثلاً گزرے ہوئے اولیاء اللہ کی شفاعت کا عقیدہ اور ان کے مزارات پر ان عقائد کے ساتھ

زیارت کے لیے جانا — کی مذمت کی گئی ہے اسی موضوع پر ان کا رسالہ کشف الشبہات بھی ہے جس میں انھوں نے اسلام اور جاہلیت کے فرق کو عقائد اور اعمال کی میزان میں رکھ کر بعض شبہات کا ازالہ کیا ہے۔

۴۵ قرآن اور حدیث کے درس وتدریس کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنے میں شاہ ولی اللہ سے تقریباً ۱۰۰ سال پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے لیکن اس وقت کے جامد مسلم معاشرے میں شیخ دہلوی کی اس کوشش سے کوئی قابل ذکر حرکت پیدا نہیں ہوسکتی تھی صحاح ستہ کے بجائے علماء کے حلقے میں بھی مشارق الانوار کو پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ سے پہلے تک دینی تعلیم کی بنیاد حصول علم سے زیادہ تکمیل ضرورت تھی تاکہ افتاء اور قضا کے سرکاری منصبوں کے لیے علماء میسر آسکیں اسی طرح اعلیٰ سرکاری اور درباری حلقوں میں شعر وادب اور معلومات فقہ کے ذریعہ رسائی ہوسکے اسی لیے علمی انہماک اور اخلاص کی مثالیں اس دور میں نسبتاً کم نظر آتی ہیں نیز اسی وجہ سے بسا اوقات قانون اسلامی کو بادشاہ وقت کی مصلحتوں کے مطابق تعبیرات آسانی سے حاصل ہوجاتی تھیں اس عدم اخلاص کی وجہ سے بارہا علماء کے درمیان زبردست اختلافات اور مناظروں تک نوبت پہنچ جاتی تھی شریعت کی اسی غیر خالص قانونی تعبیر کے نتیجے میں جو موقع کی مناسبت سے توڑ مروڑ کر پیش کی جاتی تھی۔ طریقت وسلوک کا وہ آزادانہ ارتقاء اور پھیلاؤ عمل میں آیا جس کو حقیقی اسلامی زندگی کا ترجمان سمجھ لیا گیا۔

مسلم پرسنل لاء اور اسلام کا عائلی نظام

(از مولانا شمس تبریز خاں صاحب، رفیق مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ)

اپنے موضوع پر اردو میں پہلی مستقل کتاب جو اپنے مباحث وموضوعات کے تنوع اور مسلم پرسنل لاء کے مکمل ومدلل تعارف کے لئے امتیاز خاص رکھتی ہے جس میں مسلم پرسنل لاء کی شرعی حیثیت اور اس کے امتیازی پہلوؤں سے تفصیلی اور تحقیقی بحث کی گئی اور کتاب وسنت اور علوم عصریہ سے یکساں طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عورتوں سے متعلق اسلامی اور غیر اسلامی قوانین کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

چند اہم عنوانات: (۱) مسلم پرسنل لاء کی شرعی حیثیت۔ (۲) مسلم پرسنل لاء کے امتیازی پہلو (۳) عورت غیر اسلامی تہذیب وشریعت میں (۴) اسلام میں عورت کا مقام (۵) اسلام کے عائلی نظام کی چند جھلکیاں وغیرہ۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم (سابق ناظم دار المصنفین) کے مقدمہ اور دو نئے ابواب کے اضافے کے ساتھ دوسرا ایڈیشن

معیاری کتابت، آفسٹ طباعت۔ قیمت مجلد سترہ روپئے صرف صفحات ۲۸۶

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ